

رسل صاحب

رالف رسل کے جنازے میں جس کسی سے بھی میری ملاقات ہوئی اس نے پہلا سوال یہ کیا: ”رالف کو آپ کیسے جانتے ہیں؟“

کیسے جانتا ہوں؟ قصہ یہ ہے کہ جب میں وسط لندن میں برٹش لائبریری کی ایک شاخ میں کام کرتا تھا، وہاں چاروں اطراف زبانیں سیکھنے کے ادارے دیکھ کر مجھ پر دنیا بھر کی زبانیں سیکھنے کا جنون سوار ہو گیا۔ سوائے انگریزی کے، جو مجھے اس وقت آتی تھی اور نہ ہی اب آتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو زبانیں میں سیکھنا چاہتا تھا وہ میں نے سیکھ لی ہیں۔ اصل میں مجھے اردو سمیت کوئی زبان بھی نہیں آتی۔ تاہم میں نے کئی اداروں میں بہ یک وقت داخلہ لے لیا، جن میں ایک ادارہ ”سٹی لٹ“ بھی تھا۔ ایک شام میں سٹی لٹ کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا کہ میرے کانوں میں اردو پڑھانے کی آواز سنائی دی۔ دروازے پر ”رالف رسل“ لکھا ہوا تھا۔ میں نے دستک دی۔ ایک نہایت ہی خوش مزاج، خوش شکل اور مسکراتے ہوئے معصوم چہرے نے دروازہ کھولا۔ اس چہرے پر وہی معصومیت تھی جو ایک نوزائیدہ بچے کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اس شخص میں اس مخدومانہ اور مرتبہ انداز کا دور دور بھی نشان نہیں تھا جو اس زمانے میں سابقہ کالونیوں کے باشندوں سے ملتے وقت انگریزوں کا ہوتا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ رسل صاحب نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، ”آئیے بشیر صاحب،“ اور کاغذ کی ایک شیٹ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا، ”آپ پڑھائیے، بشیر صاحب۔“ پہلے تو میں گھبرا سا گیا اور پھر خود کو سنبھالتے ہوئے پڑھانا شروع کیا:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

اس کے بعد انھوں نے ایک اور شیٹ پکڑادی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس ملاقات کے بعد میں کوئی تین چار مرتبہ ان کی کلاس میں گیا۔ اسی دوران کرمس اور سالی نو کی چھٹیاں آ گئیں۔ یہ میری بد نصیبی تھی کہ اس کے بعد میں نے اردو کے اس دیوانے انگریز اور اس سے بڑھ کر ایک عظیم اور بے حد سچے انسان سے رابطہ نہیں رکھا۔ ”بد نصیبی“ میں نے محاورتاً استعمال کیا ہے، میں تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا ہوں۔ یہ میری سراسر کم عقلی تھی کہ میں ان سے پھر نہیں ملا۔ کوئی عشرے بھر کے بعد میں اپنی حماقت پر اچانک چونکا۔ جب سٹی لٹ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ ایفریکن اسٹڈیز سے نظریاتی اختلافات کی بنا پر قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے چکے تھے۔ میرے پاس ان کا ٹیلی فون نمبر تھا نہ ہی گھر کا پتا۔ اب یاد نہیں رہا کہ ان کا پتا کہاں سے حاصل کر کے خط لکھا تھا۔ ان کا جواب تھا:

احمد بشیر صاحب۔ آداب۔

آپ کا خط، جو نہ کسی بلکہ صحیح معنوں میں عنایت نامہ تھا، آج صبح ملا۔ آج ہی میں دو کتابیں سیکنڈ کلاس پوسٹ سے بھیج رہا ہوں۔ آپ کی دعوت سے میں بڑا خوش ہوا۔ آپ کو نہ تو ضرور آؤں گا اور آپ کو نہ بھی ضرور آؤں گا! آپ کو نہ تو کندھوں پر لا کر مجھے لانا ہوگا نہ کار بھیجی (یا لکھنؤ کے محاورے میں بھیجنا) پڑے گا! میں آپ کے گھر کی منزل خود ہی طے کر سکتا ہوں۔ البتہ اگر آپ کے ہاں دیر ہو جائے تو آپ مجھے رات کو سونے کی جگہ دے سکتے ہیں؟ زحمت نہ ہو تو مجھے فون کیجیے تاکہ آنے کا وقت طے کر سکیں۔

آپ کا

رالف

رسل صاحب کے جملے ”آسکوں تو ضرور آؤں گا اور آپ کو نہ سکوں تو بھی ضرور آؤں گا!“ کا پس منظر جانے بغیر قارئین اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں گے۔ رسل صاحب کو مدعو کرت وقت میں نے اپنے خط میں بچپن کے زمانے کی پڑوسن کی بیٹی کا حوالہ دیا تھا، جو بڑی بڑی آنکھوں والی، خوش شکل اور دراز قد تھی، مگر تھی تلخ مزاج۔ یہ میری ہم عمر تھی۔ جب ہمارے گھر آتی تو کسی چیز کا مطالبہ یوں کرتی: ”میری ددو (ماں) نے کہا ہے اگر ہے تو بھی دیں اگر نہیں ہے تو بھی دیں!“ حقیقت یہ ہے کہ ہم مطلوبہ شے سب کی سب ددو کی

خوب صورت مگر بد مزاج بیٹی کے حوالے کر دیتے، حتیٰ کہ وہ چیزیں بھی جو ہم نے مہمانوں کے لیے اٹھا رکھی ہوتیں۔ یہ ہمارے خاندانی کلچر کا ایک حصہ تھا۔

رسل صاحب اپنی پہلی آمد کے بعد شدید مصروفیت کے باوجود وقت نکال کر ہر تین ماہ بعد ہمارے گھر ضرور آتے تھے۔ انھوں نے بعض اصول وضع کر رکھے تھے جن کی خلاف ورزی وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ اپنی ڈائری دیکھ کر دن کا تعین کرتے اور پوچھتے: ”کیا یہ دن آپ کے لیے مناسب ہے؟“ پھر کہتے: ”بھئی میں حسب معمول شام پانچ بجے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ صبح سات بجے اٹھوں گا۔ آٹھ بجے ناشتا کروں گا۔ دس بجے گھر روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ کیجیے گا۔“

میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ جب وہ پہلی دفعہ آئے تھے میں انھیں لینے اسٹیشن گیا تھا۔ وہ ناراض ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں کبھی نہیں گیا۔ میری عادت ہے کہ مہمانوں کی کار ہمارے گھر سے کتنی ہی دور کیوں نہ کھڑی ہو، میں انھیں اس تک چھوڑنے جاتا ہوں۔ اگر ٹیوب سے آئیں، تو چوں کہ میں خود تو کار نہیں چلاتا، بیگم سے درخواست کرتا ہوں کہ چلیے ان کو کار میں گھر تک چھوڑ آتے ہیں۔ اور ایک رسل صاحب تھے کہ ہمیں دروازے کی دہلیز کے باہر نہیں آنے دیتے تھے۔ یہ مجاور تا نہیں کہ رہا۔ جس زمانے میں بس میں کنڈیکٹر بھی ہوتا تھا اور مسافروں کو بس میں چڑھنے سے روکنے کے لیے دونوں بازو پھیلا دیتا تھا، اسی طرح رسل صاحب ہمیں دروازے کی دہلیز کے باہر قدم رکھنے سے روکنے کے لیے بازو پھیلا دیتے تھے۔ ”اس سے آگے آپ نہیں آئیں گے!“ پھر فٹ پاتھ سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر ”خدا حافظ“ کہتے تھے۔

ایک دن جب رسل صاحب کے آنے کا وقت تھا، بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ اتنی تیز اور زوردار کے چھتری بے کار ہو گئی۔ ہماری بیگم نے کہا کہ وہ مجھے اسٹیشن چھوڑ آتی ہیں اور جب رسل صاحب پہنچ جائیں تو میں انھیں فون کر دوں، وہ آکر لے جائیں گی۔ میں نے کہا وہ ناراض ہوں گے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ ”آج وہ خود ہی اسٹیشن سے فون کریں گے۔“ رسل صاحب نے فون نہیں کیا اور وہ پانی میں شراپور ہمارے گھر پہنچے۔ چاہے جھکڑ آئے، چاہے طوفان، مقررہ وقت پر ان کا آنا کبھی منسوخ نہیں ہوتا تھا۔ جب ان کا ہمارے ہاں آنے کا دن قریب آتا، میں ان کے فون کا انتظار کرنے لگتا تا کہ معلوم ہو جائے کب آرہے ہیں اور ہم اس دن پہلے سے کوئی پروگرام نہ بنا بیٹھیں۔ لیکن ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب ہمارے یہاں آمد کی بابت ان کا فون آیا تم میں نے معذرت کی، ”رسل صاحب، بے حد افسوس ہے کہ اس دن کے لیے میں تین ماہ پہلے کسی کا دعوت نامہ قبول کر چکا ہوں۔ کوئی اور دن رکھیے۔“ بولے کہ ایک ماہ سے پہلے نہیں آسکوں گا۔

”آپ مجھے فون کیجیے گا یا میں خود دن طے کرنے کے لیے فون کر لوں گا۔“ جب وہ آئے تو میں نے کہا، ”رسل صاحب اس بار آپ چار ماہ بعد آئے ہیں۔ اس کی تلافی کے لیے اگلی مرتبہ آپ دو ماہ بعد آئیے۔“ بولے، ”نہیں۔ یہ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں تین ماہ بعد آؤں گا۔“

وہ ہماری بیگم مینا اور بیٹی شازیہ سے بھی بہت مانوس ہو گئے تھے۔ آتے ہی پوچھتے کہ شازیہ کب آئیں گی؟ جہاں تک ناچیز کا تعلق ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے زیادہ چاہنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے صرف اتنا لکھ کر انھیں پوسٹ کر دیا: ”کب صبح خن ہوگی، کب شام نظر ہوگی۔“ ان کا فون آیا، ”بھئی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف آپ ہی کو انتظار رہتا ہے۔ آپ کے ہاں آ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔“

رسل صاحب نے ایک مرتبہ بتایا کہ انھوں نے کرشن چندر سے کہا کہ آپ کے اسی فی صد افسانے اگر ضائع ہو جائیں تو اردو ادب کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہ قول رسل صاحب، یہ سن کر کرشن چندر بالکل ناراض نہیں ہوئے بل کہ یہ کہا، ”آپ منٹو کے افسانے ترجمہ کیجیے۔“

جب کبھی میں پاکستان کا پھیرا لگا کر لوٹتا اور ان سے ان کتابوں کا ذکر کرتا جو تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہیں ملی ہوتیں تو اگلے ہی دن وہ وہی کتابیں مجھے ڈاک سے بھیج دیتے۔ ایک دفعہ ایسی ہی ایک کتاب کے کسی مضمون کے حاشیے پر رسل صاحب نے باریک پینسل سے ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا: "not worth the paper it's written on"، جب کہ اسی کتاب میں ایک اور مضمون کی انھوں نے بے حد تعریف کی تھی۔ خیال رہے کہ مصنف صاحب کا شمار بے حد معروف اور پسندیدہ مصنفین میں ہوتا تھا۔

صاف گوئی میں رسل صاحب اپنی مثال آپ تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے والد بزرگوار کو بھی نہیں بخشا تھا، جنہیں وہ چاہتے بھی بہت تھے۔ ان کے والد کو غبن کے جرم میں نوکری سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھنے سے قبل کھانے کی میز پر ہمیں بتایا تھا۔ اگر ہمیں بتانے کے بعد وہ اس کا ذکر اپنی سوانح عمری میں نہ کرتے تو میں اسے یہاں ہرگز بیان نہ کرتا۔

رسل صاحب بہت تیز نظر تھے۔ ایک مرتبہ میری بیگم سے مخاطب ہو کر بولے، ”مینا، میں نے آپ کو آج تک بشیر صاحب کو ’تم‘ کہتے ہوئے نہیں سنا۔ آپ انھیں ہمیشہ ’آپ‘ کہ کر پکارتی ہیں۔‘ سنیے۔ ادھر آئیے۔ آپ کہاں ہیں۔“ ہماری بیگم شرما گئیں۔ میں نے کہا رسل صاحب، مینا روایت پسند ہے اور یہ لکھنؤ کا کلچر ہے۔

ایک شام رسل صاحب نے کھانے کی میز پر اپنے کسی ہندوستانی مسلمان دوست کا ذکر کیا جو مورتی رکھتے

تھے اور ان کی بیگم اپنے ہاتھ سے انھیں سو رپکا کر دیتی تھیں، گو سو رپکا نے اور کھانے کے برتن الگ رکھتی تھیں۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ کیا وہ خنزیر کھائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے! پھر میں نے انھیں اپنا قصہ سنایا کہ برٹش لائبریری کی کینٹین میں ایک مرتبہ میں نے کرسپس کا ایک پیکٹ بھی اٹھالیا۔ میز پر جا کر جب کرسپس کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا تو اس سے اُن جانے گوشت کی مہک آتی محسوس ہوئی۔ میں نے پیکٹ وہیں میز پر چھوڑ دیا اور فوراً بھاگا ہوا گیا اور منہ کا کرسپس کوڑے میں ڈال دیا، واش پیسن میں خوب گھلی کی اور میز پر واپس آ کر کافی پینے لگا۔ ساری کینٹین نے گردنیں اٹھا کر مجھے تعجب سے دیکھا (کرسپس میں سو رپ کی چربی نہیں تھی، بس سو رکا بناوٹی ذائقہ پیدا کیا گیا تھا)۔ اس بازخوانی کے بعد میں نے رسل صاحب کے سنائے ہوئے قصے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا: ”رسل صاحب،“ میں نے کہا، ”یہ بنت العجب جس سے اس وقت آپ لطف اندوز ہو رہے ہیں، اسے سنگ روم اور ڈائینگ روم میں پینے کے لیے مجھے باقاعدہ جہاد کرنا پڑا۔ ایک وہ مسلمان خاتون تھیں جو اپنے مسلمان شوہر کو اپنے دست مبارک سے سو رپکا کر دیتی تھیں، اور ایک ہماری بیگم ہیں جو مجھے گھر کے اندر سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ہاں اگر میں گندے اور غلیظ ”پب“ میں یا دروازہ بند کر کے پلنگ کے نیچے چھپ کر یا صوفے پر بیٹھ کر پلاسٹک کے کپ میں پیتا اور ہر گھونٹ کے بعد کپ کو صوفے کے پیچھے مٹری کے جالے میں چھپا دیتا اور جیب میں چھوٹی الائچیاں بھی رکھتا تو شاید ہماری بیگم کو بہت زیادہ اعتراض نہ ہوتا۔

میں نے رسل صاحب کو بتایا کہ اس گنہ گار نے پانچ سے پندرہ سولہ سال کی عمر تک نمازیں بھی پڑھی ہیں، اذانیں بھی دی ہیں، اور روزے بھی رکھے ہیں، بعض اوقات بغیر حری کھائے ہی۔ میں نے اپنی بیگم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا، ”رسل صاحب، میری بیگم مذہبی نام کو نہیں ہیں۔ یہ نماز نہیں پڑھتی ہیں، روزے نہیں رکھتی ہیں، حج عمرے پر نہیں گئی ہیں اور نہ ہی جائیں گی، کوئی نذر نیا نہیں کرتی ہیں، قرآن کو انھوں نے چھوا تک نہیں ہے (جب کہ میں نے لندن آنے کے بعد قرآن کے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے پڑھا ہے)، مگر اس بیگم سے شراب پینے کے لیے مجھے جہاد کرنا پڑا ہے۔ سارا مسئلہ پاکستانی کلچر کا ہے۔ یہ لوگوں سے ڈرتی تھیں۔ میں ان سے کہتا تھا کہ ان لوگوں سے نہیں ڈرو جن کا ایک کوٹھی سے دل نہیں بھرتا اور وہ غریبوں کا خون پی کر پاکستان کے ہر شہر میں محلات تعمیر کراتے ہیں۔ لندن کے ”مے فیئر“ میں جائیدادیں خریدتے ہیں۔ اب ان کی سمجھ میں شاید بات آگئی ہے۔“ رسل صاحب مسکرائے۔ میں نے کہا، ”اب یہ بہت نرم ہوگئی ہیں۔ میں بوتل کھولنے میں ابھی تک اناڑی ہی ہوں۔ جب کبھی مے خور مہمان آتے ہیں تو کھانا میز پر لگانے

سے پہلے شور مچانے لگتی ہیں، بوتل کھولنے میں آپ کو گھنٹا لگتا ہے۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں بوتل کھول دوں؟ میں کہتا ہوں، نہیں، سید زادی، آپ کے ہاتھ بھر شٹ ہو جائیں گے۔“

مجھے اندازہ ہوا کہ رسل صاحب شراب سے بھی اتنے ہی لطف اندوز ہوئے جتنے میری گفت گو سے، اور کہنے لگے آپ اپنی سوانح عمری لکھیے۔ یہ مشورہ وہ پہلے بھی دے چکے تھے: ”بشیر صاحب، آپ سفر نامے لکھنے پر وقت نہ ضائع کیجیے، اپنی سوانح عمری لکھیے۔ سفر نامے مجھے اچھے نہیں لگتے۔“

ہماری بیگم کھانے کے بعد مہمانوں سے کہا کرتی تھیں، ”آپ نے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔“ شروع میں ایک آدھ بار انھوں نے رسل صاحب سے بھی یہی کہا۔ رسل صاحب لکھنؤ کے کلچر کے اس پہلو سے واقف تھے۔ اگلی مرتبہ انھوں نے ہماری بیگم کو یہ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کھانے کے بعد ان سے مخاطب ہو کر بولے، ”مینا، اب آپ یہ نہیں کہیں گی، رسل صاحب، آپ نے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔“ میں نے ان سے کہا، ”اب ہماری بیگم لکھنؤ کا کلچر بھول گئی ہیں۔ ان کا لکھنؤی کلچر ساڑھی باندھنے اور سینے۔ ادھر آئیے۔ آپ کہاں ہیں؟“ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔“ رسل صاحب بہت ہنسے۔ میں نے اضافہ کیا، ”اکثریتی کلچر بے چارے اقلیتی کلچر کو ہڑپ کر جاتا ہے۔“ رسل صاحب پھر ہنسے۔

رسل صاحب جن میں بے پناہ خوبیاں تھیں ان کے کردار کے ایک پہلو کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی منکسر المزاج رسل صاحب ہیں جو سب انسانوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ اب سینے: ایک مرتبہ انھیں ہمارے یہاں آنا تھا۔ میں نے ان سے پوچھے بغیر ایک انگریز خاتون کو بھی مدعو کر بیٹھا۔ یہ خاتون فرانسیسی کی رٹائرڈ پروفیسر تھیں، جرمن اور روسی زبانیں بھی جانتی تھیں، خوب گھومی پھرتی تھیں۔ رسل صاحب کے برعکس وہ یہ توقع کرتی تھیں ہم انھیں ٹیوب اسٹیشن سے لے کر آئیں اور پھر چھوڑ کر آئیں۔ وہ رسل صاحب کی آمد سے پہلے ہی پہنچ گئی تھیں۔ جب رسل صاحب آئے تو میں نے تعارف کرایا۔ انھوں نے کوئی پانچ دس منٹ تک گلے سے سریں نکال کر توالی کے بارے میں ان خاتون کو سمجھایا۔ پھر اچانک کھڑے ہو گئے، بیگ اٹھایا اور کہا، ”اچھا بشیر صاحب، خدا حافظ!“ میں پریشان سا ہو گیا۔ ہاتھ پکڑ کر انھیں بٹھایا۔ کھانے کے بعد رسل صاحب سونے چلے گئے اور میری بیگم اور میں خاتون کو جو وسط لندن میں رہتی تھیں کار سے ٹیوب اسٹیشن تک چھوڑنے گئے۔ اگلے روز رسل صاحب کے جانے کے بعد میں نے انھیں معذرت نامہ پوسٹ کیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے بعد جب ہمارے ہاں آئے تو صرف اتنا کہا، ”بشیر صاحب، میں آپ سے ملنے آتا ہوں۔ مجھے کسی اور سے ملنے کا شوق نہیں ہے۔“

اگلی مرتبہ جب ان کے آنے کا وقت تھا، گھنٹی بجی اور اس خیال سے کہ وہ آگئے ہیں، میں نے دروازہ کھولا۔ رسل صاحب تو نہیں تھے، ان کے بہ جاعے ایک فرانسیسی تھے جن سے ہماری اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ خوش مزاج اور بزلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھنے میں بڑا لطف آتا تھا اور میں ان سے زبان اور کلچر کے بارے میں بہت کچھ سیکھتا بھی تھا۔ ان میں خرابی بس یہ تھی کہ بغیر فون کیے چلے آتے تھے۔ میں گھبرا سا گیا، تاہم انھیں اندر بلانا پڑا۔ ”کافی پیو گے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ بھی حیران ہو گیا، کیوں کہ وہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ میں اسے کافی پیش کروں گا۔ ”ناں۔ کیا مصروف ہو؟“ میں نے جواب دیا، ”ہاں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا، ”پھر کبھی آنا۔“ لیکن وہ نہیں آیا اور ہم سے ملے بغیر ہی فرانس واپس چلا گیا۔ اس خوش گفتار، مزے دار آدمی کو میں نے رسل صاحب کی بھینٹ چڑھا دیا، جس کا مجھے افسوس ہے۔ اُدھر وہ صاحب گئے، اُدھر رسل صاحب آئے۔

ایک مصنف جن کی ساری عمر پڑھنے لکھنے میں گزری تھی اور رسل صاحب کے بے حد مداح بھی تھے پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ رسل صاحب بھی کسی وجہ سے ان کے نام سے واقف ہو گئے تھے۔ میں نے انھیں فون کیا اور کہا کہ ان صاحب کو آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ رسل صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے کہا، ”یہ آپ کے بڑے مداح ہیں۔ جس دن اور جس وقت آپ کہیں گے، وہ آپ کے پاس حاضر ہو جائیں گے۔ آپ دس منٹ تو ان کے لیے نکال سکتے ہیں۔“ لیکن انھوں نے کھرا سا جواب دیا، ”نہیں، بشیر صاحب، میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ مجھے یہ سن کے سخت افسوس ہوا۔

ایک شام کھانے کی میز پر خود ہی کہا، ”بشیر صاحب، جس کو میں اچھی طرح جانتا ہوں اسے آپ بلا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا، ”جب آپ آئیں گے تو کیا میں فلاں کو بلا سکتا ہوں؟“ بولے، ”ہاں، ٹھیک ہے، بلائیے۔“ پانچ منٹ بعد بولے، ”نہیں، بشیر صاحب، نہ بلائیے۔“ میں یہ مشکل اپنی ہنسی روک سکا۔

رسل صاحب کو ہمارے خاندان کے بارے میں بہت تجسس تھا اور اس کے بارے میں وہ بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ ایک دن اپنی بیاض کھول کر بیٹھ گئے اور کہا کہ اپنے بھائیوں کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ ”اوپر سے شروع کیجیے۔“ میں نے عبدالحمید (حمید کا شمیری مرحوم) سے شروع کیا اور جب چوتھے بھائی نصیر احمد کے بارے میں بتا چکا تو بولے، ”رک جائیے۔ اگلے بھائی تک نہ بڑھیے۔ آپ کے یہ بھائی مجھے بہت دل چسپ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں اور بتائیے۔“

رسل صاحب کا حافظہ بھی بلا کا تھا۔ کبھی میں نے ان سے ہمارے کراچی کے ایک اہل زبان دوست کا

ذکر کیا تھا جن کے پسندیدہ مصنف احمد ندیم قاسمی تھے اور جب انھوں نے قاسمی صاحب کو ٹیلی وژن پر جنرل ضیا الحق سے ایوارڈ لیتے دیکھا تو فوراً اٹھے اور اپنے لائبریری سے قاسمی صاحب کی ساری کتابیں اٹھا کر کوڑے میں ڈال دیں۔

اس قصے کے ایک عرصے بعد میں نے انھیں اپنے بھائی حمید کاشمیری کی کتابیں دیں۔ جب وہ آئندہ ہمارے گھر آئے تو مسکراتے ہوئے بولے، ”احمد ندیم قاسمی نے آپ کے بھائی کے بارے میں بھی تو لکھا ہے۔“

میں اب ان سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ ان سے کہا کہ آپ ہمیشہ فون پر یہ کہتے ہیں کہ اتنے بچے ہمارے گھر پہنچیں گے، اتنے بچے سونے چلے جائیں گے... ”آپ اپنی آواز ریکارڈ کیوں نہیں کر لیتے۔ فون کرتے وقت کیسیٹ آن کر دیا کریں۔“

ایک اور موقع پر میں نے ان سے کہا کہ رسل صاحب، آپ اردو اور ہندی پڑھانے کے بہانے جوان جوان لڑکیوں کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ وہ آپ کے گلاس میں بیئر انڈیلیتی ہیں۔ یہی تو آپ کی جوانی کا راز ہے۔ مجھے آپ کبھی نہیں بلاتے۔ ”آپ خود ہی نہیں آتے،“ رسل صاحب بولے۔ ”آپ کو کون منع کرتا ہے۔“

آخری مرتبہ وہ کب ہمارے ہاں آئے مجھے کچھ یاد نہیں رہا ہے (ان کی ڈائری میں لکھا ہوگا)۔ بس اتنا یاد آتا ہے کہ میں نے ان سے برٹش لائبریری میں ہندوستان کے ساٹھ سالہ جشن آزادی کے اہتمام میں نمائش کا ذکر کیا تھا جو کوئی تین چار ماہ تک جاری رہی۔ میں نہ جاسکا لیکن رسل صاحب گئے۔ بعد میں میں نے ان سے ممنوعہ کتاب ”انگارے“ کا ذکر کیا جو معلوم ہوا تھا کہ نمائش میں موجود تھی۔ ۱۹۳۲ میں شائع ہونے والی اس کتاب سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں تھا۔ انھوں نے کہا، ”میرے پاس یہ کتاب ہے۔ اگلی بار جب آؤں گا تو آپ کے لیے لیتا آؤں گا۔ پوسٹ نہیں کروں گا۔“ گھر جا کر انھوں نے فون کیا کہ وہ کتاب قاسم دلوئی صاحب کے پاس ہے اور وہ ہندوستان گئے ہوئے ہیں۔ جب واپس آئیں گے تو ان سے لوں گا ورنہ شبانہ محمود سے لے کر آپ کو دوں گا۔ آپ رکھ لیجیے گا۔ ان کے پاس ایک فالتو نسخہ ہے۔“

ادھر عرصے سے انھوں نے اپنے دوستوں کو ہفتہ واری روداد ای۔میل کرنا شروع کی تھی، بعض اوقات ہفتے میں دو بار۔ ۶ مئی ۲۰۰۸ والی روداد میں لکھا تھا ۳۰ اپریل کو وہ St. Georges اسپتال گئے تھے جہاں یورالوجی کے ”ٹاپ کنسلٹنٹ“ مسٹر بیلی نے بتایا کہ ان کے مٹانے میں بڑا بھاری کینسر ہو گیا

ہے۔ رسل صاحب نے ان سے پوچھا کہ مرض کی پیش گوئی کیا ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ وہ اپنے مریضوں کو اس طرح کی باتیں بتانا پسند نہیں کرتا۔ ”لیکن مجھے بتانا ہی ہوگا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ چھ سے آٹھ ماہ تک آپ کے زندہ رہنے کا امکان ہے۔ رسل صاحب نے تین صفحات پر مشتمل اس روداد میں اپنے کینسر کا ذکر یوں کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

مرض کی پیش گوئی کے بعد بھی ہندی، اردو پڑھنے والوں کے علاوہ پی ایچ۔ ڈی۔ کرنے والے بھی مشورے کے لیے آتے رہے اور ان کے ای۔ میلز کا سلسلہ بھی اسی باقاعدگی سے جاری رہا۔ رسل صاحب کا آخری ای۔ میل ۱۲ اگست کو آیا۔ پھر ۵ ستمبر کو ان کے بیٹے ایسن کی طرف سے ای۔ میل ملا کہ رسل صاحب کا کینسر جگر تک پھیل گیا ہے اور اب کسی دن بھی انھیں Trinity Hospice میں منتقل کر دیا جائے گا۔ سنیچر کی سہ پہر کوئی چار بجے ہماری چھوٹی سی فیملی (میری بیگم اور میں، ہماری بیٹی اور تین سالہ نواسی) انھیں دیکھنے ہاسپس پہنچ گئے۔ وہ پلنگ پر قیص اور بنیان اتارے بیٹھے تھے۔ ان کی دوست میرین وہاں موجود تھیں۔ ہماری پوری فیملی کو دیکھ کر رسل صاحب بہت خوش ہوئے۔ میں نے انھیں بوسہ دیا۔ انھوں نے بھی مجھے پیار کیا۔ پھر میری بیٹی نے پیار کیا اور میری بیگم نے بھی پہلی بار۔ رسل صاحب نے سبھوں کو جواباً پیار کیا۔ ہماری نواسی دروازے کے پاس کھڑی ترجمانی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہی۔ اسے اور رسل صاحب دونوں کو توریتیا (tortilla) بہت پسند تھی۔ دونوں چٹنی کے ایک ہی پیالے سے توریتیا ڈبو کر کھاتے تھے۔

جب انھوں نے مجھ سے کہا کہ اتنی دور سے آنے میں ہمیں بڑی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی، تو میں نے کہا، ”رسل صاحب، آپ ہی نے ایک دفعہ کہا، تھا ’بشیر صاحب، انگریزی کا محاورہ from door to door بہت اچھا ہے۔ مجھے اپنے گھر سے آپ کے گھر تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگتے ہیں۔ تو کیا آپ کو زحمت نہیں اٹھانا پڑتی تھی؟“ اس پر مسکرا دیے اور پوچھا، ”آپ کے بھائی کیسے ہیں؟ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟“ اور پھر میرے تھیلے پر ان کی تیز نظر پڑی اور کہا، ”دکھائیے، یہ کون سی کتاب آپ پڑھ رہے ہیں؟“ پھر ہماری بیٹی شازیہ سے مخاطب ہوئے، ”شازیہ، بہادر شاہ ظفر کیسے ہیں؟“ (ہمارے داماد کا نام ”ظفر“ ہے۔)

جمعرات، ۲۸ جون ۲۰۰۷ کو رسل صاحب کی اردو خدمات (Urdu, 1950-2007) کے سلسلے میں SOAS میں ان کا جشن منایا گیا تھا جو صبح نو بجے سے رات گئے تک جاری رہا تھا۔ شرکت کے

لیے مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ میں بیگم کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ رسل صاحب انھیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے: ”مینا، مجھے بشیر صاحب کی تو پوری توقع تھی کہ ضرور آئیں گے۔ آپ کی امید نہیں تھی۔“ پھر انھیں گرم جوشی سے گلے لگایا اور پیار کیا۔

رسل صاحب کے SOAS کے پروگرام کی شیٹ جس پر ان کی خوب صورت تصویر بھی ہے، ہوسپس کی دیوار پر چسپاں تھی اور کمپیوٹر کی کاری گری سے بعد میں اس میں ان کی بیٹیوں ایلن اور سیرا اور بیٹے اسٹن کو بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ میں کرسی سے اٹھ کر تصویر دیکھنے لگا۔ رسل صاحب بولے، ”بشیر صاحب، میرے بچے بہت اچھے انسان ہیں۔ آپس میں بھی ان کا بہت پیار ہے۔ ان سے میں بہت خوش ہوں۔“ سوچئے: اس کمال کے توے سالہ شخص نے جسے یہ معلوم تھا کہ وہ اسپتال میں نہیں بل کہ ہوسپس میں بستہ مرگ پر ہے، شام کو مجھ سے یہ پوچھا کہ میں آج کل کیا لکھ رہا ہوں (”دکھائیے، یہ کون سی کتاب آپ پڑھ رہے ہیں؟“)، میرے اُن دیکھے بھائیوں کی خیریت بھی معلوم کی اور بذلہ گوئی کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا، اگلی صبح کو انتقال کر گیا۔

سوموار، ۲۲ ستمبر کو رسل صاحب کا جنازہ تھا۔ میری بیگم اور میں شرکت کے لیے گئے۔ اسٹن کو اپنے والد سے ہمارے گہرے تعلقات کا علم تھا۔ انھوں نے گرم جوشی سے ہم دونوں کو گلے لگایا اور پیار کیا۔ لوگ اتنے زیادہ تھے کہ کرسیاں کم پڑ گئیں۔ بہت سے لوگ کھڑے رہے، بہت سے فرش ہی پر بیٹھ گئے۔ خیال رہے کہ رسل صاحب اعلانیہ منکر خدا تھے۔ یہ ان کی انسان دوستی کا ثبوت تھا کہ ان کے جنازے میں عیسائیوں، سکھوں، ہندوؤں، اور میرے جیسے گنہ گار مسلمانوں کے علاوہ صوم و صلوة کے پابند اور پارسا باریش مسلمانوں نے بھی شرکت کی۔ شمشیر سنگھ، جن کے بارے میں رسل صاحب اکثر مجھے بتایا کرتے تھے، کینیڈا سے شرکت کے لیے آئے۔

رالف رسل نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ ان کے تابوت پر ڈالنے کے لیے پھولوں پر رقم خرچ کرنے کے بہ جے یہی رقم تامل نادو (ہندستان) کے ایک خیراتی ادارے کو بھیج دی جائے (جس کی نشان دہی بھی انھوں نے کر دی تھی)، اور جنھیں ان سے اپنی محبت کا اظہار کرنا ہے وہ اپنے باغ سے واحد پھول یا ایک ننھی سی ٹہنی لا کر تابوت پر ڈال دیں۔

جنازے پر ان کے رشتے داروں، دیرینہ دوستوں اور سابقہ طلبہ اور طالبات نے ان کے علمی کارناموں، اردو کے لیے ان کی خدمات، انسان دوستی اور ان کی زندگی کے گونا گوں پہلوؤں پر روشنی

ڈالی۔ اسن نے اپنے والد کی زندگی کا تفصیل سے ذکر کیا اور کہا کہ یہ زندگی گیتوں سے بھرپور تھی۔ وہ ساری عمر ریہ ڈالی۔ اسن نے اپنے والد کی زندگی کا تفصیل سے ذکر کیا اور کہا کہ یہ زندگی گیتوں سے بھرپور تھی۔ وہ ساری آسان عمر ریت شکن رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے ایک مرتبہ یہ کہا کہ انھیں بولنے کی نسبت گیت گانا گایا۔ [آسان لگتا ہے۔ آخر میں اسن نے رسل صاحب کا پسندیدہ گیت "I'm Against It" آکر کسٹر کی دھن پر خط کے گایا۔] اس گیت کے سارے بول، جو اسن رسل نے اس سالنامے کے مدیر کو بھی بھیجے تھے، بشیر صاحب کے خط کے آخر میں نقل کیے جا رہے ہیں۔]

جولوگ آخری رسومات مذہب انسانیت کے پیروکار Jeanne Rathbone نے انجام دیں اور کہا کہ احترام جولوگ پھول لے کر آئے ہیں یکے بعد دیگرے تابوت پر ڈالیں۔ اس کے بعد انھوں نے رسل صاحب کی نگاہ احترام میں حاضرین سے کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ تابوت کی طرف دیکھ کر سرنگوں کیا۔ پردہ گر گیا۔ سب کی نے احترام سے اوجھل رسل صاحب آن کی آن میں راکھ میں تبدیل ہو گئے۔ Jeanne Rathbone نے احترام اور سنجیدگی سے بھرپور لہجے میں کہا، ”رالف کائنات کا جز بن گئے ہیں۔“

برطانیہ! ٹونگ براڈوے کی ہائی اسٹریٹ پر ”شہناز انڈین ریسٹورینٹ“ میں کھانے کا انتظام تھا۔ ۲۲ ستمبر کو گھر۔ برطانیہ میں ۲۲ واں روزہ بھی تھا۔ روزہ داروں سے پہلے کہا گیا تھا کہ وہ افطار کے لیے ریسٹوراں سے کھانا گھر لے جانے میں جھجک محسوس نہ کریں۔

کے بعد جنازے کی تقریب میں بات چیت کے دوران میرین نے مجھے بتایا کہ ہوسپس سے میرے جانے "Ralph, why are you smiling?" کے بعد رسل صاحب مسکرا رہے تھے۔ جب میرین نے پوچھا، "Ralph, why are you smiling?" میری سب "smiling?" تو رسل صاحب نے جواب دیا، ”بشیر صاحب...“ ان دو لفظوں کے بعد میرین نے کیا کہا رسل صاحب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں پوچھنے والا تھا کہ کسی نے انھیں پکارا اور وہ ادھر چلی گئیں۔ مجھے تجسس رہے گا کہ رسل صاحب نے انتقال سے ایک دن پہلے میرے بارے میں کیا کہا تھا۔

سے بھی میں نے رسل صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے، لیکن یقین مانیے کہ ایک چیز رسل صاحب نے اس ناچیز وہ گرم جوش سے بھی سیکھی ہے۔ وہ مجھ سے ملتے وقت اردو والوں کی طرح ہاتھ ملاتے تھے۔ میری کتابیں پڑھنے کے بعد وہ گرم جوش سے بغل گیر ہوتے تھے اور بوسہ دیتے تھے۔ اس کی تفصیل شاید میری کتابوں میں ہو۔

مجھے تو ابھی سے ان کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ □

Appendix

I'm Against It

(From the Marx Brothers' film Horse Feathers)

Musicians play

I don't know what they have to say
It makes no difference anyway:
Whatever it is,
I'm against it.
No matter what it is or who commenced it:
I'm against it.

La-la-la, la-la-la, la-la, la

I'm opposed to it.
On general principles
I'm opposed to it.
He's opposed to it,
In fact he's bit-ter-ly opposed to it.

La-la-la, la-la-la, la-la, la

Musicians play

Your proposition may be good
But let's have one thing understood
Whatever it is,
I'm against it
And even when you've changed it or condensed it
I'm against it.

La-la-la, la-la-la, la-la, la

I'm opposed to it
On general principles
I'm opposed to it
He's opposed to it,
In fact he's bit-ter-ly opposed to it

He's against it